مولانا رومؒ اور اسلام کی تعبیرِ نو

MOWLANA RUM & REINTERPRETATION OF ISLAM

Dr. Ansar Madni
Dr. Fiza Muslim

Abstract:

Almighty Allah has made certain laws for the development and success of mankind.Without understanding and obeying these laws, no nation can even dream of well growth. According to divine laws of development, the process of boom and doom of any nation follows this pattern: Every nation who uses her resources in an optimum way in the leadership of some personalities among that the institutions start to emerge and make it impresses other nations. At the moment if intellectual elite doesn't plan for the future the downfall of that nation starts. In this short article, those contributions of Mowlana Rum are discussed those helped to enhance the capabilities of Muslims on the fronts of education, literature, religion, civilization, culture and ideology.

Key words*: Islam, Mowlana Rum, Reinterpretation, Civilization.*

کلیدی کلمات: اسلام، مولانا روم، تعبیرِ نو، تہذیب۔

خلاصہ:

اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ بشر کی ترقی و کمال کے خاص قوانین اور اسباب رکھے ہیں جنہیں سمجھے اور ان کی پیروی کیے بغیر کوئی قوم ترقی و کمال کا خواب نہیں دیکھ سکتی۔ خداوند تعالیٰ کے بنائے ہوئے ترقی و تکامل کے قوانین کے مطابق قوموں کے عروج و زوال کی داستان یہ ہے کہ ہر قوم جب اپنی قیادت کی ہدایات کے مطابق اپنے خداداد وسائل کا استعمال کرتی ہے تو ترقی و تکامل کی منزلیں طے کرتی ہے۔ دوسری قومیں اس کی ترقی سے مرعوب ہوتی ہیں لیکن عین اسی لمحے اگر اس قوم کا دانشور اور صاحبِ رائے طبقہ اس قوم کی مزید پیشرفت کی منصوبہ بندی نہ کرے تو اسی مرحلہ پر اس قوم کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ مسلم امّت کے عروج و زوال کی داستان بھی ایسی ہی ہے۔ مسلم امّت کی ترقی و کمال کے لئے مولانا روم نے اسلام کی تعبیرِ نَو پیش کرتے ہوئے تعلیم، تہذیب اور ادبیات کے حوالے سے جو خدمات سرانجام دی ہیں، اِس مقالہ میں اس کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

اقوام کی سرنوشت کے مراحل

معلوم تاریخ اور ماقبلِ تاریخ سے متعلق جو آثار ملتے ہیں ان سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسانی ترقی کے پیچھے جو اسباب کار فرما ہیں، ان کی تشخیص کیے بغیر کوئی بھی قوم ترقی کے خواب نہیں دیکھ سکتی ہے۔ کیونکہ یہ دنیا خدا کی بنائی ہوئی ہے۔اس میں رہنے اور ترقی کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ یہاں خدا کے بنائے ہوئے قوانین سے موافقت کرکے زندگی گزاری جائے۔ جو لوگ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں، وہ کامیابی حاصل کرتے ہیں اور جو لوگ ایسا نہکریں وہ بربادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ قوموں کے بارے میں خدا کے بنائے ہوئے عروج وزوال کے قانون کی بھی یہی حیثیت ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی قوم کو اس قانون سے استثنا مل جائے، مگر جو قومیں اس قانون اور اس کے پس پردہ کام کرنے والے اسباب وعلل کو سمجھ لیتی ہیں، وہ عروج کی منزلیں جلد طے کرتی ہیں۔ ان کے اقبال کا زمانہ طویل اور زوال کا دور ممکنہ حد تک دور ہو جاتا ہے"۔[1] بہر صور، ہر قوم اپنی تشکیل، ترقی اور تنزلی میں کچھ مراحل طے کرتی ہے۔ ذیل میں ان مراحل کو بیان کیا گیا ہے۔

1. **تشکیل کا مرحلہ:** یعنی منتشر افراد میں ایک ایسی سوچ کو اجاگر کرنا، جس کی بدولت وہ ایک دوسرے کے قریب آسکیں اور اقوامِ عالم میں اپنی ایک انفرادی حیثیت بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔
2. **شناخت کا مرحلہ:** جب کسی قوم کی اجتماعی سوچ نمایاں ہو جاتی ہے تو پھر اس کی شناخت کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی قوم میں سے ایسے افراد سامنے آتے ہیں جو قوم کی صحیح معنوں میں رہنمائی کرتے ہیں۔ اچھائی اور برائی میں تمیز، نقصان اور فائدہ مند چیزوں کی نشاندہی کرکے قوم کو ایک متفقہ نقطہ پر مجتمع کرتے ہیں۔
3. **استحکام کا مرحلہ:** یعنی اس مرحلے میں قوم کے افراد کو وسائل سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا ہے اور قومی سطح پر ایسے ادارے وجود میں آنا شروع ہوتے ہیں جن سے براہِ راست قوم فائدہ اٹھاتی ہے۔
4. **کمال کا مرحلہ:** جب کوئی قوم کمال کی منزل پر پہنچ جاتی ہے تو دوسری اقوام اس کے طرزِ زندگی سے نہ صرف متاثر ہوتی ہیں بلکہ وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے اپنا سر تسلیم خم کر لیتی ہیں۔
5. **انحطاط کا مرحلہ:** دورِ عروج میں اگر قوم کے سنجیدہ افراد آنے والے حالات کے لئے مناسب پیش بندی نہ کریں اور عیش وعشرت اور غرور وتکبر میں مبتلا ہو جائیں تو پھر اس قوم پر انحطاط کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے یعنی قومی سطح پر شخصیات کے بننے کا عمل رک جاتا ہے اور ایک لحاظ سے قحط الرجال کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اور قوم غیر محسوس انداز میں زوال کی طرف بڑھتی ہے۔

6. **زوال کا مرحلہ:** دورِ انحطاط میں چونکہ قوم عیش و عشرت کی زندگی میں کھو کر افراد کی بے پناہ صلاحیتوں کو ضائع کر چکی ہوتی ہے اور قوم کی رہنمائی کرنے والے افراد کا ظہور مکمل طور پر بند ہو چکا ہوتا ہے، اس لئے منزل زوال میں قومی سطح پر جو ادارے کام کر رہے ہوتے ہیں وہ باصلاحیت افراد کی عدم دستیابی کی وجہ سے تباہی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس دور میں اندرونی خلفشار اور بیرونی خطرات کی صورت میں قوم تباہی کا سامنا کر رہی ہوتی ہے۔
7. **تباہی کا مرحلہ:** زوال کی مدت چاہے جتنی بھی طویل ہو مگر تباہی اس قوم کے مقدر میں ہوتی ہے اور وہ بہت جلد اقوامِ عالم میں اپنی شناخت کھو دیتی ہے۔

اقوام کی تباہی کے اسباب

یہاں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ افراد کا وہ مجموعہ جو قومی سطح پر اپنی بہترین صلاحیتوں کی اظہار کی بدولت کوئی مقام پاتا ہے۔ مجموعی طور پر اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ علمی وفکری بنیادوں پر کام کرنے والے افراد پر مشتمل ہوگا۔ جب کہ دوسرا حصہ ظاہری اور مادی بنیادوں پر کام کرنے والے افراد پر مشتمل ہوگا۔ اس لحاظ سے جب کسی قوم کی تکمیل یا عروج کا زمانہ ختم ہو جائے اور وہ زوال و تباہی کی طرف بڑھے تو مذکورہ دونوں حصے متاثر ہوتے ہیں اور اس کی بنیادی طور پر چار اسباب ہو سکتے ہیں۔

سببِ اول: قومی سطح پر جن متفقہ اصولوں کو وضع اور متعین کیا گیا تھا ان کی سماجی اور اقتصادی قدروں کو فروغ دینے اور اصلاحات نافذ کرنے میں مجرمانہ کوتاہی کی گئی ہو۔

سببِ دوّم: پیشوائی اور رہنمائی کے منصب پر ایسے افراد جلوہ افروز ہو جائیں جو اپنے فرائض کو نہ صرف فراموش کریں بلکہ وقتی منفعت کی خاطر حقیقی مسائل سے چشم پوشی کریں۔

سببِ سوّم: حکمراں طبقہ مالی بدعنوانی کا شکار ہو جائے اور اقرباء پروری کی روش اپنائے۔

سببِ چہارم: حکمران طبقہ اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لئے ہر قسم کے حربے کو استعمال کرنا جائز سمجھیں۔ جب ہم درج بالا نقاط کی روشنی میں مولانا رومؒ کے عہد کا جائزہ لیتے ہیں تو مولانا رومؒ کی حیات وخدمات پر کام کرنے والے محققین کا یہ خیال ہے کہ: ''رومی ۱۲۰۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۳ء میں انہوں نے وفات پائی۔ یہ دور مسلمانوں کے لئے انتہائی ذلت اور زوال کا دور ہے جب انہیں دو مختلف قسم کے دشمنوں سے سابقہ پڑا۔ ایک طرف صلیبی جنگوں کا آغاز ہو چکا تھا جن کے باعث فلسطین اور ارد گرد کے علاقے یورپ کے وحشی فوجیوں کے ہاتھوں بری طرح پائمال ہو رہے تھے۔ دوسری طرف منگولوں کے ظالمانہ حملوں سے ہر طرف تباہی اور مکمل بربادی کا

خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے عبرت کا سماں پیش کر رہا تھا۔ چنگیز خاں نے ۱۲۱۹ء میں ان حملوں کا آغاز کیا جس سے مسلمانوں کے اکثر ملک تباہ و برباد ہو گئے اور پھر ۱۲۵۶ء میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں دوسری بار تباہی کا آغاز ہوا جس کے باعث ۱۲۵۸ء میں خلافت بغداد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ تیسری طرف ہسپانیہ میں بھی مسلمانوں کی عظیم سلطنت ۱۲۶۶ء میں ختم ہو گئی"۔[2]

اس اعتبار سے مولانا رومؒ کل ۶۶ سال کی عمر شریف پاتے ہیں اس عرصے میں آپ نے مسلمانوں پر بیرونی جارحیت کے بدترین مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یعنی چنگیز خان اور ہلاکو خان کی درندگی، قتل وغارت اور مسلمانوں کی نسل کشی تو ایک طرف مگر صلیبی جنگوں کا تسلسل ہنوز جاری تھا یعنی "۱۰۹۵ء بمطابق ۴۴۴ھ کو عیسائیوں نے بیت المقدس فتح کر لیا اور اس قدر خونریزی کی کہ ساٹھ ہزار کی آبادی والے شہر کو پورا کا پورا تہہ تیغ کر ڈالا۔ بیت المقدس کے صحن میں خون کا دریا بہنے لگا۔ اس طرح قبلہ اول مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد اگلے کئی سو سال مسلمانوں اور عیسائیوں میں مستقل لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا"۔[3] اس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا رومؒ کا یہ عہد نہ صرف مسلمانوں کے لئے بیرونی جارحیت کا بدترین عہد تھا، بلکہ اندرونی طور پر بھی مسلمان خلفشار کا شکار تھے۔ "رومی کے زمانے میں مُلّا ظاہر پرست رہ گیا تھا اور فقیہ دفتر پرست۔ یہ گروہ دین کے مغز کو چھوڑ کر ہڈیاں چبا رہے تھے بلکہ ان ہڈیوں پر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ اسی صورت حال کے متعلق مولانا روم کا یہ مشہور شعر ہے:

من ز قرآں بر گزیدم مغز را　　　　استخواں پیش سگاں انداختم[4]

یعنی مولانا رومؒ نے اہلِ دانش کی توجہات اس اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرانے کی بھرپور کوشش کیں کہ دین اسلام کی جو اصل روح ہے اس کو اقوامِ عالم کے سامنے پیش کریں اور آپس کی سطحی اور فروعی اختلافات کو ہوا نہ دیں۔ اس طرح کے طرزِ عمل سے اسلامی تعلیمات کی نشرواشاعت کا سلسلہ محدود ہو کر رہے گا۔ اور مسلمانوں کی اجتماعی وحدت کو شدید نقصان پہنچے گا۔ مگر آپؒ کی اس فکر کو اُس دور میں اہمیت نہیں دی گئی اور "مسلمانوں کی تاریخ باہمی جنگوں اور آپس کی فتوحات اور شکستوں سے لبریز ہے۔ کبھی ایک خاندان برسر اقتدار آتا اور کبھی دوسرا، لیکن ان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک غیر مسلم قوم نے مسلمانوں کو شکست دی اور شکست بھی ایسی جس سے ان کے ذہن اور جسم دونوں مضمحل ہو کر رہ گئے۔ لازماً سوچنے والے ذہنوں میں یہ سوال ابھرا کہ کیا دین اسلام میں وہ صلاحیت موجود ہے جو وہ آج تک اس سے منسوب کرتے چلے آ رہے تھے؟ کیا وہ عقلی طور پر انسانوں کے لئے قابلِ قبول ہے؟ کیا وہ محض اَن پڑھوں، بدوؤں اور صرف عربوں کا دین ہے یا متمدن لوگوں کے لئے بھی اس کے پاس کچھ ہے؟ غرض اس دور کے مسلمان اسلام کی حیات بخش اور حیات پرور تعلیم سے مایوس ہو رہے تھے۔ ان کے سامنے اسلام کا شاندار ماضی ضرور تھا، لیکن اس کا حال بالکل تباہ حال تھا اور مستقبل میں کوئی

امید کی کرن نظر نہ آتی تھی۔ اس ذہنی مایوسی اور علمی کم مائیگی کے دور میں رومی نے اسلام کی نئی تعبیر پیش کی، جس میں ایک طرف اس وقت تک کی تمام علمی فتوحات کی مدد سے اسلام کا ایک ایسا خاکہ پیش کیا جو ذہنوں کو مطمئن کر سکے اور دوسری طرف ان لوگوں کے قلب کو گرما سکے جو زندگی کے اس مایوس کن ماحول میں جرات مندانہ قدم اٹھانے کو تیار تھے"۔ [5]

فاضل مقالہ نگار نے مسلمانوں کے جن اندرونی مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے اور مسلمان بحیثیت قوم جس مایوسی اور ذہنی انتشار اور طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا تھی۔ مولانا رومؒ نے حالات حاضرہ کا باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہوئے اس قوم کو مایوسی اور ناامیدی سے نکالنے کی یقیناً بھرپور جدوجہد کی۔ اور اسلام کی تعبیرِ نو کے سلسلہ میں جن زاویوں کو منتخب کیا ان میں سے ایک تصوفانہ روش اختیار کرنا بھی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اس بات کی یوں وضاحت کرتے ہیں: "صوفیانہ شاعری کی ترقی کے بہت سے اسباب پیدا ہوگئے، تاتاریوں کے ہنگامہ نے جو اسی زمانہ میں شروع ہوا تمام اسلامی دنیا کو زیروزبر کردیا۔ اینٹ سے اینٹ بج گئی، مشرق سے مغرب تک سناٹا ہوگیا۔ تصوف کی بنیاد دنیا و مافیہا کی بے قدری اور بے حقیقتی ہے، یہ سب کو آنکھوں سے نظر آ گئی، اس حالت میں جو دل متاثر اور قابل تھے، ان کو خدا سے زیادہ لو لگی، انابت، خصوع، تضرع، رضا بالقضاء، توکل جو تصوف کے خاص مقامات ہیں خود بخود دل پر طاری ہوئے اسی کا نتیجہ ہے کہ جس کثرت سے صوفی شعراء اس زمانہ میں پیدا ہوئے کسی زمانہ میں نہیں پیدا ہوئے، مولانا روم، سعدی، اوحدی، عراقی سب انہیں اسباب کے نتائج ہیں۔
صوفیانہ شاعری کی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ تصوف میں ابتدا ہی سے اخلاق کے مسائل شامل ہوگئے تھے، کیونکہ اخلاق کو تصوف سے ایک خاص تعلق ہے، اخلاق کا فن اس زمانہ میں نہایت وسیع ہوگیا تھا۔ احیاء العلوم نے اس فن کے دقیق اسرار عام کر لئے تھے، محقق طوسی نے اخلاق ناصری میں ارسطوکے فلسفیانہ اخلاق ادا کیے اس کے اثر سے شاعری میں اخلاق کا ایک سرمایہ مہیّا ہوگیا اور یہ سب تصوف کے حصہ میں آیا، چھٹی صدی میں فلسفہ کو عام رواج ہوا، اور مذہبی گروہ میں بھی فلسفہ کی کتابیں درس میں داخل ہوگئیں، چنانچہ اس دور کے جس قدر مذہبی علماء ہیں، فلسفہ سے بھی آشنا ہیں، صوفیہ کے گروہ میں مولانا روم اور شیخ محی الدین اکبر فلسفہ کے پورے ماہر تھے، اس لئے خود بخود ان کی تصنیفات میں فلسفہ کا امتزاج ہوگیا، تصوف کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی سرحد فلسفہ سے ملتی ہے، مثلاً وجودِ باری، وحدت الوجود، جبر واختیار، حقیقتِ روح وغیرہ، اس لئے ان مسائل میں فلسفہ کا اثر آنا ضرور تھا، غرض اب تصوف اور صوفیانہ شاعری اسی طرح فلسفہ سے ممزوج ہوگئی جس طرح اس زمانہ کا علم کلام، طبیعیات اور فلکیات کے مسائل سے مملو ہے ان اسباب سے صوفیانہ شاعری زیادہ وسیع اور زیادہ دقیق اور عمیق ہوگئی، اس عہد کے مشہور صوفی شعراء میں عراقی، سعدی اور مولانا روم ہیں۔ [6]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا رومؒ نے اپنے عہد کی ان تمام فکری اور علمی پیچیدگیوں کو نہ صرف آسان زبان میں سلجھانے کی کوشش کیں، بلکہ پوری ذمہ داری کے ساتھ ان مسائل کا حل پیش کیا۔ مثلاً:

1) مولانا رومؒ نے بانسری کے بیان سے روح کی ماہیت اور اس کے جذبات کو دل نشین اور دل سوز انداز میں پیش کیااور یہ ثابت کیا کہ روح چونکہ اپنی اصل سے جدا ہو چکی ہے اور اسے بہر حال اپنی اصل کی طرف لوٹنا ہے یعنی "یاایتھاالنفس المطمئنة ارجعی الی ربك راضیة مرضیة" کی منتظر ہے۔ اور کس خوبصورتی کے ساتھ نہ صرف روح کی اضطرابی حالت کو بیان کیا ہے بلکہ اس معاملہ میں مختلف ادیان و مذاہب کی تحریفی روش کو اجاگر کیا ہے۔

2) وحدت الوجود کے مسئلہ پر صوفیاکے خلاف جو تحریک چلی اور اس کے نتیجہ میں علماء کو وحدت الشہود کا نظریہ پیش کرنا پڑا۔ یعنی" وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں فلسفے ذاتِ باری تعالیٰ اور مخلوقات وممکنات کے تعلقات کو بیان کرتے ہیں اور ان دونوں فلسفوں کو توحیدِ عینی اور توحیدِ ظلّی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں"۔ [7] مولانا رومؒ اس ضمن میں جہد وجہد اور سعی و عمل کے بہت بڑے داعی تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہاتھ پاؤں دیئے ہیں۔ تاکہ وہ کوشش کرے اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ اسی طرح مولاناؒ فرماتے ہیں:

رمز الکاسب حبیب اللہ شنو　　　　از توکل در سبب کاہل مشو

کمانے والا اللہ کا دوست ہے کااشارہ سن توکل کی وجہ سے اسباب اختیار کرنے میں سستی نہ کر

در توکل کسب و جہد اولیٰ ترست　　　　تا حبیبِ حق شوی این بہترست

کمانااور کوشش کرنا توکل کے معاملہ میں بہت بہتر ہے۔ تاکہ تو اللہ کا سہارا بن جائے یہ اچھا ہے۔ [8]

3) جبر وقدر کے سلسلے میں گروہ جبریہ، گروہِ قدریہ، اور اشاعرہ کے نظریات بہر حال تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ جبر و اختیار کے سلسلے میں مولاناؒ فرماتے ہیں:

I. "ہر شخص کے دل میں اختیار کا یقین ہے گوزبانی اس کا انکار کرے اگر اسی شخص کے سر پر چھت ٹوٹ پڑے تو کبھی چھت پر غصہ نہ کرے گا اور اگر کوئی دوسرا شخص اس کے سر پر پتھر مار دے تو اس پر اس کو سخت غصہ آئے گا اور یہ اسی بنیاد پر ہے کہ چھت کو اس نے غیر مختار سمجھا ہے اور اس شخص کو اس نے صاحبِ اختیار مانا ہے"۔

II. "خود انسان کے تمام اقوال وافعال سے اختیار کا ثبوت ہوتا ہے۔ ہم کسی شخص کو کسی کام کے کرنے کا حکم دیتے ہیں، کسی کو کسی کام کے کرنے کی ممانعت کرتے ہیں۔ اپنے کسی فعل پر خود

نادم ہوتے ہیں اور کسی فعل پر خوش، یہ اس کی دلیل ہے کہ ہم خود آپ کو اور دوسرے کو صاحبِ اختیار سمجھتے ہیں"۔

III. "جبر کے ثبوت میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر خدا ہمارے افعال پر قادر نہیں ہے تو مجبور ہے اور اگر قادر ہے اور بندہ کو بھی قادر مانا جائے تو ایک فعل کے دو فاعل قرار پاتے ہیں جو باطل ہے۔ مولانا نے اس شبہ کا جواب دیا جو شبہ کا جواب بھی ہے اور بجائے خود بندہ کے اختیار کے لئے دلیل بھی ہے۔ فرمایا جو چیز کسی چیز کی ذاتیات میں سے ہے وہ سلب نہیں ہوتی ہے۔ لوہار کے بسولے میں جبر ہے لوہار کا آلہ بننے کی وجہ سے۔ اس کا جبر سلب نہیں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اختیار انسان کی ذاتیات میں سے ہے۔ اگر اللہ کو فاعل مانا جائے اور انسان اس کے لئے بمنزلہ آلہ کے ہو تب بھی اس کا اختیار باقی رہے گا، انسانی اختیار مسلوب نہ ہوگا اور نہ جبر سے تبدیل ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کا کفر کرنا اللہ کی مرضی سے ہے تو بھی خود یہ ثابت ہو رہا ہے کہ کفر کافر کا فعلِ اختیاری ہے ورنہ کافر، کافر نہیں ہے"۔

IV. "انسان کے تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے ان کا صدور انسان سے ہوتا ہے اللہ کے خالق ہونے کی وجہ سے بسا اوقات افعالِ عباد کی نسبت اللہ کی طرف کر دی جاتی ہے ورنہ دراصل وہ بندہ کا فعل ہے"۔[9]

یہی وہ حقائق ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا رومؒ نے اپنے عہد کی نزاکتوں کو سمجھتے ہوئے اس پر کام کیا اور عمومی طور پر اسلام کی تبلیغ واشاعت کا اہتمام۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ لکھتے ہیں: "اسلام میں تصوف کے عناصر ابتداء سے ہی موجود چلے آتے ہیں اور گو کہ ابتدائی زمانہ کے صوفی بہت ہی برگزیدہ لوگ تھے اور ان کی تعلیم کسی طرح مذہب اور عملی زندگی کے مخالف نہ تھی مگر رفتہ رفتہ نوافلاطونی خیالات اور بعض دوسرے نظام ہائے فکر کی آمیزش سے، تصوف میں دنیا سے بیزاری کا عنصر، بطور ایک سیاسی عقیدے کے شامل ہو گیا، جس سے توکل، تقدیر، فنا اور ترکِ دنیا کی طرح کے مسائل کی غلط تعبیر پیدا ہوئی۔ یہ فلسفہ زندگی جس قدر جذبۂ حیات کا قاتل ہے، اسی قدر اسلام کی عملی تعلیم کے منافی بھی ہے۔ مولانا جلال الدین رومی نے خود صوفی ہونے کے باوجود اس طرزِ زندگی بلکہ اس نظریہ زندگی کے خلاف پر زور آواز بلند کی اور توکل، جبر، کسب اور دین و دنیا کے باہمی تعلق پر پیہم اور مسلسل، نہایت مؤثر اور دل نشین پیرائے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا"۔[10]

مذکورہ خیالات کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا رومؒ کے کلام میں اتنی وسعت اور تازگی ہے کہ یہ ہر زمانے کے سوچنے والے ذہن کو متاثر کر سکتا ہے اس کی ایک زندہ مثال خود علامہ اقبال ہیں: رومی کا کمال یہ ہے کہ انہوں

نے انسان کی روحانی واخلاقی حدود کو اتنا وسیع اور محکم کردیا ہے کہ مابعد الطبیعی انداز نگاہ بھی اس کے احاطے سے قاصر اور اثبات پر مجبور ہے یہ وصف اقبال کو بھی منتقل ہوا ہے، مگر اس فرق کے ساتھ کہ بنیادی امور مثلاً خودی اور اس کی سب سے بڑی قوت یعنی عشق، رومی کا تجربہ ہے اور اقبال کا نظریہ۔ رومی کے لئے معنی کوئی علامتی اور ذہنی چیز نہیں بلکہ تکمیلِ حال کا نام ہے کیونکہ حقیقت، کسی عقلی اثبات کی نہیں بلکہ وجودی وابستگی کی متقاضی ہے، اس لئے وہ فہم اور شرائطِ فہم کو شعورِ حقیقت کی ماہیت سے متصادم قرار دے کر حقارت سے ردّ کردیتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ اپنے اندر عارفانہ تحکم رکھتا ہے، عقل اس کی منکر نہیں متمنی ہے، بلاشبہ غیر پیغمبرانہ لڑیچر کی پوری تاریخ میں رومی واحد شخصیت ہیں، جس نے حقائق کو فلسفہ مابعد الطبیعیات، عقل پرستی اور تجربیت کی گرفت سے نکال کر ان تک رسائی کے نئے راستے نکالے ہیں اور شعور کی نئی اساس دریافت کی ہے"۔[11]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ علامہ اقبالؒ جیسا بیدار ذہن ہی مولانا رومؒ کی باریک بینیوں کو سمجھ سکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ اپنے اشعار میں مولانا رومؒ کو پیرِ روم یا مرشدِ روم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں کہ ''رومی کی مثنوی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تمام عقلی علوم سے کماحقہ واقف تھا اور ان سے واقف ہوتے ہوئے بھی ان میں جس قدر حقیقت کا پہلو ہے، اس کو اپناتے ہوئے بھی وہ کسی محدود اور ظنی عقلیت کا شکار نہ تھا بلکہ ہر مسئلہ پر رومی غیر معمولی بصیرت اور غیر معمولی جرات سے تنقید کرتا تھا۔ وہ عقل کو خدا کی ایک عظیم نعمت سمجھتا ہے اور حکمت کا دلدادہ ہے، لیکن اس کے ہاں عقل وحکمت کے دائرے بڑے وسیع ہیں۔ ان کی عقل صرف مادیات اور حیات تک محدود نہیں۔ وہ عقل کو صفات اللہ کا ایک عالمگیر مظہر تصور کرتا ہے چنانچہ کہتا ہے:

ع آں چہ دریاہاست در پہنائے عقل

اس کے نظریہ حیات میں مادے سے لے کر خدا تک زندگی ہی زندگی ہے، لیکن انتہائی پستی سے انتہائی بلندی تک اس کے بہت سے مدارج ہیں۔ ہر درجہ حیات زندگی ہی کا ایک درجہ ہے اور جہاں زندگی ہے وہاں کسی نہ کسی درجے کی عقل بھی ہے۔ چنانچہ عارف رومی عقل جمادی، عقل نباتی، عقل انسانی اور عقل نبوی کے مدارج کا ذکر کرتا ہے۔ خدائے حکیم کی خلقت اور مظاہر میں سے کوئی مظہر حکمت سے خالی نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جس درجے کا مظہر ہے، اسی درجے کی عقل ہے''۔[12]

یہی وجہ ہے کہ جب مولانا رومؒ نے اپنا مافی الضمیر مثنوی معنوی کی شکل میں ترتیب دیا تو اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ آپؒ کے کلام کو ہست قرآن در زبان پہلوی کہا جانے لگا۔ ''قرآن کے بعد جس کتاب کے ذریعے زمین وآسمان کو تسخیر کرنے والے علوم وحکمت تک رسائی ہوتی ہے وہ مثنوی ہے اور اس میں عصر حاضر کے ان پیچیدہ مسائل کا

حل بھی موجود ہے جن سے انسان حواس باختہ ہو کر اپنی تقدیر سے مایوس ہو جاتا ہے"۔یعنی مولانا رومؒ نے اپنے کلام کے ذریعے ایک طرف مسلمانوں کو مایوسی کی کیفیت سے نکالنے کا کام کیا تو دوسری طرف اسلام کے بنیادی عقائد کو ایک نئے انداز میں حکمت ودانائی سے بیان کیا: "مولانا روم کے کلام میں حکمت اور علم کلام کے بڑے بڑے مسائل شعری زبان میں ادا ہوگئے ہیں۔ صفات باری، نبوت، روح، معاد، جبر وقدر، تصوف، توحید، اور علمی موضوعات میں سے تجدد امثال اور مسئلہ ارتقاء جیسے اہم مسائل کی تعبیر موجود ہے"۔ [13]

فاضل مقالہ نگار نے جو علمی موضوعات کی طرف اشارہ کیا ہے اس ضمن میں مولانا رومؒ کے کچھ اشعار جو فلسفہ کشش کو ظاہر کرتے ہیں جس کی بنیاد پر کائنات کا نظام قائم ہے۔

جملہ اجزاء جہاں زاں محکم پیش　　　　جفت جفت وعاشقاں جفت خویش

یعنی: دنیا کے تمام اجزاء جوڑ، جوڑ ہیں۔اور ہر ایک اپنے جوڑے کا عاشق ہے۔

آسماں گوید، زمیں را مر حبا　　　　باتوام چوں آہن وآہن رُبا

یعنی: آسمان، زمین کو خوش آمدید کہتا ہے۔ کہ میری تیری مثال لوہے اور مقناطیس کی سی ہے۔

اس کے علاوہ ذرّات کی ترکیب سے جو اجسام سامنے آتے ہیں اس کے متعلق مولاناؒ فرماتے ہیں:

میلِ ہر جزئی بہ جزئی می نہد　　　　زاِتّحادِ ہر دو تولیدے جہد

یعنی: ہر جزئی کا ایک جزئی کی طرف میلان ہے۔ دونوں کے اتّحاد سے پیدائش ہوئی ہے۔

مولانا رومؒ تجدّدِ امثال یعنی کائنات کی صورتیں ہر آن تبدیل ہونے کے عمل پر کہتے ہیں:

ہر نفس نومے شود دنیا وما　　　　بے خبر از نو شدن اندر بقا

یعنی: ہر سانس میں دنیا نئی بن رہی ہے۔ ہم اس کے نئے بننے سے بے خبر ہیں۔

عمر ہمچو جوئے نو نومی رسد　　　　مُستمِرے می نماید در جسد

یعنی: زندگی نہر کے پانی کی طرح نئی نئی آتی رہتی ہے۔ بدن میں مسلسل نظر آتی ہے۔

شاخ آتش رابہ جنبانی بساز　　　　در نظر آتش نماید بس دراز

یعنی: جلتی لکڑی کو تیزی سے گھماؤ۔ تو دیکھنے میں ایک لمبی آگ نظر آئے گی۔ [14]

یعنی انسان ہر لمحے فنا وبقاء کے عمل سے گزر رہا ہے اور یہ تبدیلی اتنی سرعت کے ساتھ وقوع پذیر ہو رہی ہے کہ بظاہر مستقل اور مستمر محسوس ہوتی ہے۔ جس طرح نہر کے پانی کی سطح جو مسلسل تبدیل ہوتی ہے مگر احساس نہیں ہوتا اور اسی طرح آگ کا وہ دائرہ جو اپنی جگہ تبدیل کر رہا ہوتا ہے مگر نگاہِ ظاہر اس کو محسوس نہیں کرتی۔

مختصراً یہ کہ مولانا رومؒ علومِ ظاہری اور علومِ باطنی کا کماحقہ ادراک رکھتے تھے۔ اور ایک عالمِ باعمل کی صورت میں اس کی ابلاغ کے لئے حدالمقدور کوشاں بھی رہے: ''مولاناؒ کا حسنِ سلوک، حسنِ معاشرت اور شریعت کی غیر معمولی پابندی ہی لوگوں کو ان کے در تک کھینچتی تھی۔ مولاناؒ کے دروازے خواص اور مالداروں سے زیادہ عوام اور غریبوں کے لئے کھلے رہتے تھے۔ مولاناؒ کے معتقدین میں جہاں مردوں کے انبوہ درانبوہ نظر آتے ہیں وہاں معتقد عورتوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ سلطان غیاث الدین کی بیگم جو قونیہ سے قیصریہ چلی گئی تھیں، جب مولاناؒ کی جدائی برداشت نہ کر سکیں تو انہوں نے ایک بازنطینی آرٹسٹ سے مولاناؒ کی تصویر بنوائی جس کو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ خود مولاناؒ کی پوتی سلطان ولد کی صاحبزادی ایک عرصہ تک کامیابی کے ساتھ طریقِ مولویت کی نشرواشاعت کرتی رہیں۔ مولاناؒ کی دوسری بیوی کرا خاتون کو بھی وہ روحانی مقام حاصل تھا کہ مولاناؒ ان کو 'سارہ' ثانی اور 'مریمِ زمانہ' کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں''۔[15]

درج بالا اقتباس میں پروفیسر اینماریا شمیل نے جن واقعات کو بنیاد بنا کر مولانا رومؒ کے حسنِ معاشرت کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا رومؒ حصولِ علم اور حصولِ معرفت کے عمل میں مرد وزن کو یکساں نظر سے دیکھتے تھے اور اس سلسلے میں ان کی بھرپور رہنمائی بھی کرتے تھے۔ تاکہ آنے والے حالات میں مسلمان ایک عالمانہ، مہذبانہ، مودبانہ اور عادلانہ نظام سے مزین گھروں سے تربیت یافتہ ہوں مولانا رومؒ نے محبت کو موضوعِ بحث بنا کر اس کا پورا حق ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے کیا خوب کہا ہے۔ جب کوئی عاشق ''محبت کی کیفیت بیان کرنا چاہتا ہے تو مادی اشیا سے تشبیہیں ڈھونڈتا ہے، کبھی اس کو آنکھوں کی ٹھنڈک کہتا ہے اور کبھی اس کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　　　اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

صوفی کہتا ہے کہ عشق ایک آگ ہے جو ماسوااللہ سب چیزوں کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے''۔[16]

یعنی مولانا رومؒ نے نہایت حکمت ودانائی کے ساتھ عشق مجازی کے جملہ خوبصورتی کی بنیادوں پر نہ صرف کاری ضرب لگائی ہے بلکہ اس کی تمام تر خوبصورتی کو عشقِ حقیقی کی طرف منتقل کیا ہے۔ مثلاً

بے غرض نبود بگردش در جہاں　　　　غیرِ جسم وغیرِ جانِ عاشقاں

یعنی: دنیا میں گردش بے غرض نہیں ہوتی۔ سوائے عاشقوں کے جسم اور جان کے۔

عاشقانِ کُل نہ ایں عُشّاقِ جزو　　　　ماند از کُل آنکہ شد مُشتاقِ جزو

یعنی: کُل کے عاشق، نہ کہ یہ جزو کے عاشق۔ جو جزو کا عاشق ہوا وہ کُل سے (دور) رہ گیا۔

چونکہ جُزوے عاشقِ جُزوے شود　　　　رُود معشوقش بکُلِّ خود رود

یعنی: جب کوئی جزو، کسی جزو کا عاشق ہو۔ اس کا معشوق بہت جلد اپنے کل کی طرف چلا جاتا ہے۔[17]

اے خدائے باعطاو باوفا　　رحم کن بر عمر رفتہ بر جفا

یعنی: اے اللہ آپ باعطا بھی ہیں اور باوفا بھی ہیں۔ اے اللہ ہماری جفاؤں پر اور ہمارے گناہوں پر رحم فرما
اب سوال ہوتا ہے کہ عطا کو وفا سے کیا نسبت ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ ہر عطا کا سبب وفا اور محبت ہے۔ حق تعالیٰ کے جو بے پایاں عطاو انعامات ہیں ان کا سبب اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ محبت ہے اور دنیا کے جتنے باعطا لوگ ہیں کسی مرحلہ پر وہ وفا سے مجبور اور عطا سے معذور ہو جاتے ہیں مثلاً کسی کا گہرا دوست مقروض ہو گیا اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے دوست کی مدد کرے لیکن اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ اس کا قرض ادا کرسکے۔ یہ شخص باوفا ہونے کے باوجود باعطا ہونے پر قادر نہیں، وفا سے مجبور اور عطا سے معذور ہو گیا۔[18] مولانا رومؒ راہِ عمل کے لئے نئی راہیں اور نئے ضابطے تراشتے ہیں وہ زندگی سے فرار نہیں، بلکہ اس سے شناسائی بڑھانے پر زور دیتے ہیں اُن کا کہنا ہے۔ آپ وہی کچھ ہیں یعنی

عشق کا دریائے ناپید کراں　　جیسی خواہش ویسی سوچ

یعنی: جیسی سوچ ویسی کامیابی　　جیسی کامیابی ویسی ہی تقدیر

محبت کی پرستاری کیوں ضروری ہے؟ محبت انسانی ذہن میں روشنی پیدا کرتی ہے اور ذہن اس روشنی کی موجودگی میں وسعت پذیر ہوتا ہے اور اس کی تخلیقی قوت میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن اس سے اہم نکتہ یہ ہے کہ محبت دوپُر اثر منفی قوتوں یعنی پندار اور تشکیک سے ذہن کو صاف کرتی ہے۔ ان منفی قوتوں کی موجودگی میں آپ نہ تو نئے خیالات کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی ذہنی ارتقاء کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں، یوں آپ علم کی اتھاہ گہرائی کو نہیں چھو پاتے۔ اس طرح یہ منفی قوتیں سوچ، خواہش، کامیابی اور تقدیر کے لئے رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اسی بناء پر رومی پکارتا ہے۔

ہر جانب تمہارا پیار ہی پیار ہے　　چہار سو گلابوں کی مہک ہی مہک ہے

میرے خوں کا ہر قطرہ پکار رہا ہے　　اپنی محبت کے رنگ میں رنگ دو

مجھے اپنی شفقت سے توانا کر دو[19]

مولانا رمؒ "شریعت کو جو تہذیب و ریاضتِ نفس کا ذریعہ ہے خاص اہمیت دیتے ہیں۔ نہ وہ ترک شریعت کی نصیحت کرتے ہیں اور نہ ہی صوفیا کی بے اعتدالیوں کو اپنانے کی اور نہ ہی وہ فقر و عزلت اور رہبانیت کے رجحانات کی تبلیغ کرتے ہیں۔ مرد کامل ان کی نظر میں وہ ہے جو صورت و سیرت دونوں لحاظ سے کامل ہو۔ اور زندگی کے حسن اور رعنائیوں سے خود کو محروم نہ کرے اور اپنے آپ کو ایک ہی دفعہ خشک زہد کے لئے وقف نہ کردے۔ وہ اہل وعیال کو بھی حجاب راہ نہیں سمجھتے اور ایک اہل کلام کی طرح تمثیلی قیاسات اور شاعرانہ تشبیہات کے ذریعہ قرآنی

تعلیمات اور اہل شریعت کی تائید واثبات میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ وہ مختلف مسائل مثلاً توحید کی حقیقت، روح کی واقعیت، حشر ونشر کی کیفیت اور جبر و اختیار کے حدود کی اہل شریعت کے نظریے کے مطابق توجیہہ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود عشق کو طریقت وشریعت کا جوہر سمجھتے ہیں اور تہذیب نفس میں محبت کو جو دل کی تربیت وتزکیہ کا سبب ہے مؤثر ترین عامل خیال کرتے ہیں۔ وہ عشق کو معراج روح کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں جو کشف حقیقت تک رسائی کے لئے اہل طریقت کی اصل غرض وغایت ہے''۔[20]

مذکورہ تمام باتوں کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مولانا رومؒ بنیادی طور پر نہ صرف ایک صوفی، شاعر یا مولوی طبیعت کے انسان تھے بلکہ ایک عالمِ باعمل، متقی اور نہایت زیرک اور بیدار ذہن کے مالک صوفی شاعر تھے۔ آپؒ اپنے عہد کے حالات سے بھی واقف تھے اور آنے والے وقتوں میں مسلمانوں کو جن علمی اور فکری بنیادوں پر اغیار سے مقابلہ ہوگا ان کے سدِّباب کے لئے آپؒ نے مختلف جہتوں پر کام کیا۔ اس بات کو اگر ہم یوں سمجھنا چاہیے کہ کسی بھی چشمے سے نکلنے والا پانی صاف وشفاف ہوتا ہے۔ یہی پانی جب آگے بڑھ کر کسی نہر سے گزرتا ہے تو اس میں آلودگی کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں اور اس آلودگی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک محسوس اور دوسرے غیر محسوس۔ محسوس آلودگی کی مثال مٹی اور کیچڑ ہے یا پھر بھیڑ بکریوں کی وہ گندگی ہے جو اس کی گذرگاہ میں شامل ہو کر پانی کی رنگت بدل دیتی ہے۔ یہ محسوس آلودگی ہے۔ ممکن ہے اس میں غیر محسوس آلودگی بھی شامل ہو۔ یعنی دیکھنے میں پانی صاف ستھرا اور چشمے سے نکلنے والے پانی کی طرح شفاف ہو، مگر کوئی ایسا آدمی اس میں غوطہ لگا کر نکلا ہو جو کسی وبائی مرض میں گرفتار ہو، اور اطراف کے رہنے والے لوگ اس پانی کے استعمال سے بیمار ہو جائیں۔ اگرچہ ظاہراً اس پانی میں کوئی آلودگی دکھائی نہ دے مگر اس میں ایسے جراثیم داخل ہو جاتے ہیں جنہیں صرف مسلّح آنکھوں ہی سے دیکھا جا سکتا ہے لیکن پھر بھی ممکن ہے اس کے مقابل ایسے آلات اور وسائل ہوں جو پانی کی اس گندگی کو دور کر دیتے ہوں۔

بالکل اسی طرح معنوی امور کی کیفیت ہے۔ یعنی ایک معنوی سرچشمہ ہے جو ابتدائی آفرینش ہی سے پاک صاف ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی آلودگی نہیں مگر بتدریج اس کا گذر اغیار کے افکار کی گذرگاہوں سے ہوتا ہے اور وہاں نسلیں اسے بعد کے ادوار میں منتقل کرتی رہتی ہیں اور یہیں سے اس میں ایک محسوس یا پھر غیر محسوس آلودگی کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ محسوس آلودگی کو انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے جب کہ غیر محسوس آلودگی صرف علماء یعنی خوردبینی آلات کے حامل افراد ہی کو نظر آتے ہیں اس لحاظ سے مولانا رومؒ نے اپنے عہد میں ان فکری آلودگیوں کو دور کرنے کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ کے بعد اس علمی اور فکری تحریک کو آنے والی صدیوں میں مسلمان فلاسفر، صوفیائے کرام، شعرائے کرام اور علمائے کرام نے جلا بخشی۔ یعنی

ساتھویں صدی ہجری کو شروع ہونے والی تحریک جب چودھویں صدی ہجری تک پہنچی تو علامہ اقبالؒ بے ساختہ یہ کہہ اٹھے۔

غلط نگر ہے تری چشم نیم باز اب تک — ترا وجود تیرے واسطے ہے راز اب تک
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک — کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک
گستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک — کہ تو ہے نغمہ رومی سے بے نیاز اب تک [21]

*****

حوالہ جات

1۔ ریحان احمد، یوسفی، عروج وزوال کا قانون اور پاکستان (لاہور، دارالتذکیر، 2003ء) 19۔

2۔ بشیر احمد، ڈار، اقبال اور رومی۔ ہمارے مسائل اور ان کا حل، پیر رومی و مرید ہندی، "مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" مرتبہ محمد اکرام چغتائی (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004) 19۔

3۔ نائمہ، صہیب، تاریخ اسلام کی عظیم شخصیات (کراچی، فضلی بک سپر مارکیٹ، 2005ء) 464۔

4۔ ڈاکٹر، خلیفہ عبدالحکیم، مولانا روم اور اقبال، پیر رومی و مرید ہندی "مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" مرتبہ محمد اکرام چغتائی (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء) 9۔

5۔ بشیر احمد، ڈار، اقبال اور رومی۔ ہمارے مسائل اور ان کا حل، پیر رومی و مرید ہندی "مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" مرتبہ محمد اکرام چغتائی (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء) 20-

6۔ علامہ، شبلی نعمانی، شعر العجم، ج5 (اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، 1918ء) 119-120۔

7۔ مولانا، قاضی سجاد حسین مترجم، مثنوی مولوی معنوی، دفتر اول (لاہور، حامد اینڈ کمپنی، 1976ء) 14۔

8۔ مولانا، قاضی سجاد حسین مترجم، مثنوی مولوی معنوی، دفتر اول (لاہور، حامد اینڈ کمپنی، 1976ء) 17۔

9۔ مولانا، قاضی سجاد حسین مترجم، مثنوی مولوی معنوی، دفتر اول (لاہور، حامد اینڈ کمپنی، 1976ء) 19۔

10۔ ڈاکٹر، سید محمد عبداللہ، اقبال اور رومی، پیر رومی و مرید ہندی "مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" مرتبہ محمد اکرام چغتائی (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء) 82۔

11۔ احمد، جاوید، رومی، پیر رومی و مرید ہندی "مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء) 354۔

12۔ ڈاکٹر، خلیفہ عبدالحکیم، مولانا روم اور اقبال، پیر رومی و مرید ہندی "مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" مرتبہ محمد اکرام چغتائی (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء) 10-

13۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، (لاہور، دانش گاہ پنجاب، 1973ء) 326۔

14۔ مولانا، قاضی سجاد حسین مترجم، مثنوی مولوی معنوی، دفتر اول (لاہور، حامد اینڈ کمپنی، 1976ء) 20=21۔

15۔ مولانا، قاضی سجاد حسین مترجم، مثنوی مولوی معنوی، پروفیسر اینماری شمیل کا مقالے سے ماخوذ، دفتر دوم (لاہور، حامد اینڈ کمپنی، 1976ء) 7۔
16۔ ڈاکٹر، خلیفہ عبدالحکیم، تشبیہاتِ رومی (لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، 1990ء) 3۔
17۔ مولانا، قاضی سجاد حسین مترجم، مثنوی مولوی معنوی، دفتر اول (لاہور، حامد اینڈ کمپنی، 1976ء) 295-296۔
18۔ مولانا، شاہ حکیم محمد اختر، فغانِ رومی (کراچی، کتب خانہ مظہری، 2000ء) 1-9۔
19۔ ظفر، عظیم، رومی کے نغمے: شخصیت فکر اور اندازِ سخن کا مطالعہ (...، لبرٹی بکس پاکستان، 2002ء) 181-183۔
20۔ ڈاکٹر، عبدالحسین زرین کوب، از گلستان عجم، ڈاکٹر مہر نور محمد خان۔ ڈاکٹر کلثوم فاطمہ مترجمین (اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، 1985ء) 170-171۔
21۔ علامہ اقبال، ضرب کلیم (اردو)، www.allamaiqbal.com

کتابیات

1) یوسفی، ریحان احمد، عروج و زوال کا قانون اور پاکستان، لاہور، دار التذکیر، 2003ء۔
2) ڈار، بشیر احمد، اقبال اور رومی۔ ہمارے مسائل اور ان کا حل، پیر رومی و مرید ہندی، "مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ"، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء۔
3) صہیب، نائمہ، تاریخِ اسلام کی عظیم شخصیات (کراچی، فضلی بک سپر مارکیٹ، 2005ء) 464۔
4) خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، مولانا روم اور اقبال، پیر رومی و مرید ہندی "مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ"، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء۔
5) شبلی نعمانی، علامہ، شعر العجم، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، 1918ء۔
6) قاضی سجاد حسین، مولانا، مثنوی مولوی معنوی، لاہور، حامد اینڈ کمپنی، 1976ء۔
7) سید محمد عبداللہ، ڈاکٹر، اقبال اور رومی، پیر رومی و مرید ہندی "مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ"، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء۔
8) جاوید، احمد، رومی، پیرِ رومی و مرید ہندی "مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ"، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2004ء۔
9) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، دانش گاہ پنجاب، 1973ء۔
10) قاضی سجاد حسین مترجم، مولانا، مثنوی مولوی معنوی، پروفیسر اینماری شمیل کا مقالے سے ماخوذ، لاہور، حامد اینڈ کمپنی، 1976ء۔
11) خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، تشبیہاتِ رومی، لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، 1990ء۔
12) شاہ حکیم محمد اختر، مولانا، فغانِ رومی، کراچی، کتب خانہ مظہری، 2000ء۔
13) عظیم، ظفر، رومی کے نغمے: شخصیت فکر اور اندازِ سخن کا مطالعہ، ...، لبرٹی بکس پاکستان، 2002ء۔
14) عبدالحسین زرین کوب، ڈاکٹر، از گلستان عجم، اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، 1985ء۔